اختر اورینوی کا تصورِ نقد

ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی

شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی، یوپی

اختر اورینوی کا شمار اردو کی صف اول کے ادیبوں میں ہوتا ہے۔ اختر اورینوی کا اصل نام اختر احمد ہے۔ان کی والدہ کا نام خدیجہ تھا۔ان کے والد سید وزارت حسین، اورین کے رہنے والے تھے اور نانیہال 'کاکو' تھا۔ان کی پیدائش ۱۹ اگست ۱۹۱۰ء کو بمقام کاکو، اپنے نانیہال میں ہوئی۔ ان کی ابتدائی تعلیم روایت کے مطابق گھر پر ہی ہوئی۔ پھر قرآن شریف ختم کیا اور اردو، فارسی اور انگریزی کی طرف مائل ہوئے۔ ۱۹۳۶ء میں ضلع اسکول مونگیر سے میٹرک کا امتحان اوّل درجے سے پاس کیا۔ ۱۹۲۸ء میں سائنس کالج پٹنہ سے انٹر سائنس کے بعد میڈیکل کالج میں داخلہ لیا، لیکن ان پر دق کا شدید حملہ ہوا نتیجتاً ڈاکٹری کی تعلیم ترک کرنی پڑی اور حصول صحت کے لیے سون ندی کے کنارے واقع ارول میں قیام پذیر ہوئے۔ بعد ازاں ۱۹۳۳ء میں پٹنہ کالج میں بی۔اے۔ آنرس انگریزی میں کیا، لیکن ۱۹۳۴ء میں پھر بیمار پڑ گئے۔اس دفعہ بیماری اتنی شدید تھی کہ انھیں رانچی کے قریب سینی ٹوریم میں داخل کیا گیا۔ ۱۹۳۶ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے اردو میں ایم کیا اور پوری یونیورسٹی میں اوّل آئے۔ ۱۹۳۸ء میں پٹنہ یونیورسٹی میں اردو کے لیکچرر مقرر ہوئے، ترقی کر کے ریڈر اور صدر شعبۂ اردو بنے۔ ۱۹۵۶ء میں ڈی لٹ کا مقالہ بعنوان ''بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا'' لکھا۔ ۱۹۶۰ء میں وہ پرفیسر ہوئے، لیکن اپنی علالت کے سبب قبل از وقت سبکدوش ہو گئے۔ ۳۱ مارچ ۱۹۷۰ء کو ان کا انتقال ہوا۔

اختر اورینوی کی شخصیت بڑی پہلودار تھی۔ وہ بیک وقت افسانہ نگار، ناول نگار، نقاد، شاعر، ڈراما نگار، مقرر اور پر وقار استاد واقع ہوئے ہیں۔ ان کے کئی افسانوی مجموعے مثلاً منظر و پس منظر، کلیاں اور کانٹے، انارکلی اور بھول بھلیاں، سیمنٹ اور ڈائنا مائٹ، کینچلیاں اور بال جبریل اور سپنوں کے دیس میں بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ جن سے ان کے خلّاقانہ ذہن کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ان کا ناول 'حسرت تعمیر' ان کی تخلیقی جہت کی عمدہ مثال ہے۔ اختر اورینوی کی خدمات کا وہ پہلو جس پر خاطر خواہ توجہ نہ دی گئی وہ ان کا تنقیدی شعور ہے، اس ضمن میں انھوں نے متعدد مقالات اور تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ فکر و نظر، تحقیق و تنقید جدید، کسوٹی، مطالعۂ اقبال، مطالعۂ نظیر، سراج و منہاج، مطالعہ و محاسبہ بطور خاص لائق توجہ ہیں۔ ان کتابوں کے مطالعے سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ اختر اورینوی تخلیق کار کے پہلو بہ پہلو تنقید کا گہرا شعور رکھتے تھے اور شعر و ادب کے تعلق سے ان کا ایک خاص تنقیدی نظریہ تھا۔

واضح رہے کہ ادب و فن میں نظریہ کی وہی اہمیت ہے جو حیات انسانی میں فکر و نظر کی ہے۔ نظریہ سے مراد کسی ادیب کے فن کی بابت تصور اور عمل دونوں سے ہے۔ معتبر شعرا و ادبا کے یہاں زندگی کے تعلق سے ایک نظریہ متعین رہتا ہے، بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ جو قلم کار جتنا باشعور ہوگا اس کے یہاں 'نظریہ' کا تصور اتنا زیادہ مربوط، مکمل اور ایک نظام زندگی کی صورت میں نمایاں ہوگا۔ باشعور نظریہ نظام حیات کے ساتھ اپنے اندر کمال فن، اندرونی ربط، موزونیت اور نفاست جیسی خصوصیات رکھتا ہے۔ معیاری ادب ہمیشہ باشعور ادیبوں کے ذہن کی پیداوار ہوتا ہے۔ جس میں محض تلقین ہی نہیں ہوتی بلکہ انسانی زندگی کے پیچ و خم، جذبات و افکار کے زیر و بم سے ہم آہنگ بھی ہوتا ہے۔ ایسا ادب انسانی دکھ سکھ، آرزوؤں، تمناؤں، امنگوں، کامیابیوں، ناکامیوں، عزائم اور حوصلوں کی نہ صرف جیتی جاگتی تصویر ہوتا ہے بلکہ اس کے اندر حلاوت یقین، مخصوص نظام حیات کی روشنی اور مقصد کو پا لینے کی توانائی بدرجۂ اتم موجود ہوتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان اوصاف سے متصف شعرا و ادبا کے یہاں نظریہ نعرہ بازی کا نام نہیں بلکہ اس کے احساسات، جذبات، جمالیاتی حس، اخلاقی قدریں، سماجی ذمہ داری جیسی اقدار اس طرح ہم آمیز ہو جاتی ہیں کہ اس کی نگارشات ایک زندہ اور متحرک صداقت بن جاتی ہیں۔ ایسی صورت میں 'نظریہ' محض تصور نہیں رہتا بلکہ دیدۂ بینا کا روپ دھار لیتا ہے۔

ادبی نظریہ سے متعلق چند باتیں جملۂ معترضہ کے طور پر پیش کی گئی ہیں۔ ورنہ کسی ادیب کے نظریۂ فن کے مرکزی نقطوں کے تعلق سے کوئی

حتمی رائے قائم کرنا ناممکن نہیں، لیکن مشکل ضرور ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ اختر اور ینوی جیسی پہلو دار شخصیت کے فکری وفنی پہلوؤں کو ملحوظ خاطر رکھ کر کوئی نتیجہ اخذ کرنا دشوار گزار عمل ہے۔ عموماً کسی ادیب کی پہلو دار شخصیت جہاں اس کے فکری تنوع کی عکاس ہوتی ہے وہیں اس کے فن کی معروضیت کے تعلق سے محاسبِ فن کے اندر بے اطمینانی بھی پیدا کرتی ہے، اختر اور ینوی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ یہی سبب ہے کہ اختر اور ینوی کے مختلف اصناف میں وسیلہ اظہار کو بھی ادبی حلقوں میں منزل مقصود سے ناواقف اور مختلف راہوں میں بھٹکنے سے تعبیر کیا گیا، لیکن یہ واقعہ ہے کہ اختر صاحب پر یہ الزام اس لیے درست نہیں کہ ان کی قوت تخلیقِ اظہار کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے مختلف تخلیقی راہوں سے گزرنے کے باوجود متعدد اصناف میں گہرے نقش چھوڑے ہیں۔ اختر اور ینوی کے نزدیک ادب وسیلہ ہے حسن، خیر اور حقیقت کی جستجو کا۔ اگر ادیب کی فکر میں پختگی ہو اور فن پر قدرت حاصل ہو تو ادبی تصور کی بازیافت کے لیے مختلف اصناف کا سہارا لینا کوئی عیب نہیں بلکہ منزل تک پہنچنے کی یہ مختلف راہیں ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بھی ضروری ہے کہ مختلف اصناف کے پیشِ نظر اہم ادیب کے فکر وفن کے تعین قدر کے ضمن میں محاسبۂ نفس پر غور وفکر بھی ضروری ہے جس کے تحت فنکار نے مختلف ادبی صنفوں کا انتخاب کیا۔ ہر ادیب کی طبیعت کا ایک خاص میلان ہوتا ہے جس کے تحت وہ تخلیقی یا تنقیدی عمل کو بروئے کار لاتا ہے جب تک ان محرکات کی نشاندہی نہ کی جائے ہماری تنقید اقدارِ فن کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتی۔

اختر اور ینوی نے اپنی تخلیقی اور تنقیدی نگارشات میں اپنے ادبی موقف کا برملا اظہار کیا ہے اس ضمن میں جبلتیں اور قدریں، ادب اور نفسیات، تخلیق وتنقید، ادب وفن کی بنیادی قدریں، فن اور ماحول، ادب میں روایات اور تبدیلیاں اور ترقی پسند ادب وغیرہ جیسے مضامین بطور خاص مثال کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں۔ یہ مضامین ان کے تنقیدی اصول و نظریاتِ فن کو پوری طرح مترشح کرتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''میں ادب وشعر کی تخلیق میں سماجی میلانات اور ماحول کی معروضیت اور مزاج کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہوں، لیکن میں اب اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس عمل میں انفرادی قوتِ تخلیق وتعمیر کی اہمیت نسبتاً زیادہ ہے۔ ناقد کا فرض ہے کہ اس پہلو پر تاکیدی نشان لگائے.....ادب میں رفیع مقصد کا ہونا بہت ہی اہم بات ہے، مگر اس کے اختراعی اور جمالیاتی مطالبوں کو پورا کرنا فنکار کا فرض اولین ہے۔''

اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ان کے نزدیک ادیب اور نقاد دونوں کے مقاصد اور منصب متعین ہیں۔ ادب محض نشاط اور اندرونی طمانیت ہی پیدا نہیں کرتا بلکہ وہ زندگی کی تشریح تعبیر اور تفہیم کے پہلو بہ پہلو حسن وانصاف کی بحالی اور بنی نوع انسان کی صلاح وفلاح کی انتھک کوشش بھی کرتا ہے۔ ان کے نزدیک ''زندگی کا ایک اعلیٰ مقصد ضرور ہے اور وہ یہ ہے کہ زندگی اور نظام زندگی کو حق وانصاف کے مطابق ڈھالا جائے۔ اسے رفعت عطا کی جائے۔ اگر ادب کے ذریعہ بھی سلیقے سے اس مقصد کا اظہار وابلاغ کر سکیں تو نور اعلیٰ نور۔''

اختر اور ینوی اس بات کے معترف ہیں کہ ادب میں تبدیلی وتغیر فطری اور لازمی ہے، ارتقا زندگی کا ایک ناگزیر اور حقیقی عمل ہے۔ ادیب زندگی، سماج، سیاست اور مذہب سے اثرات قبول کرتا ہے، ادیب بدلتے حالات اور تقاضوں سے کبھی غافل نہیں ہوتا بلکہ بدلے حالات کا وہ ترجمان ہوتا ہے۔ ان خیالات کی موجودگی میں ادیب اور انفرادی میلانات کو اہمیت دینے سے جو توازن پیدا ہوتا ہے اس کو پیشِ نظر رکھے بغیر نقاد فن پارے کے تعین قدر کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ یہ حقیقت ہے کہ اختر اور ینوی ادب زندگی اور عصری تقاضوں کا گہرا شعور رکھتے تھے جن میں نہ تو بھٹکی ہوئی انفرادیت ذہنی آسودگی کا سامان فراہم کرتی ہے نہ کوئی ایسا سماجی نظام تسلط حاصل کرتا نظر آتا ہے جو فرد کی صلاحیتوں کا گلا گھونٹ دیتا ہے، سائنس، عمرانیات، مذہب، فلسفہ اور فنون لطیفہ کی مختلف شاخوں کے وسیع مطالعے نے زندگی کی پیچیدگیوں کے ساتھ ادب کو سمجھنے کا جو شعور عطا کیا اس کی رو سے یہ مختلف مظاہر الگ الگ بھی نظر آتے ہیں اور مل جل کر ایک ایسے نقش میں تبدیل بھی ہو جاتے ہیں جس کا حسن کہیں کم نہیں ہوتا بلکہ انفرادیت رکھتا ہے۔

ان کی کتاب قدر ونظر میں شامل مضمون ''ادب وفن کی بنیادی قدریں'' میں ادب کی ان پیچیدگیوں کو سلجھانے کی کوشش کی گئی ہے جس میں عمومی طور پر نقاد الجھ کر رہ جاتے ہیں۔ اس مضمون کو ان کے نظریۂ فن کا منشور کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ یہ مضمون جہاں ایک طرف ان کے علمی تبحر کا احساس دلاتا ہے تو دوسری طرف مختلف فنون لطیفہ کی باطنی ساخت اور بنیادی مسائل کی گتھیاں بھی سلجھاتا ہے۔

اختر صاحب بہت ہی لطیف ذہنیت کے مالک واقع ہوئے ہیں۔ ان کے مزاج کی لطافت اور ذہن کی قوت تخلیق ایک ایسی دنیا خلق کرتی ہے جہاں حقائق کے احساس کے بعد ایک عالم مثال کی تلاش وجستجو دکھائی دیتی ہے۔ یہ دنیا ادیب وشاعر سے حسن کے بکھرے ہوئے جلوؤں کو ایسے

منظّم انداز میں پیش کرنے کا مطالبہ کرتی ہے جو حسن کو بقائے دوام عطا کردے۔ وہ ذوق حسن کو عطیۂ الٰہی قرار دیتے، ہر چند کہ حسن مطلق تک انسان کی رسائی ناممکن ہے، لیکن اس کا ذوق جمال اسے حسن کے گیت گانے کے مواقع ضرور فراہم کرتا ہے۔ اختر اور ینوی مذہب اور آرٹ دونوں کو ایک ہی سرچشمۂ فیض سے متعلق سمجھتے ہیں۔ یہ اقتباس دیکھیے:

''آرٹ اور مذہب دونوں کا بنیادی اور حقیقی تعلق وجدان سے ہے اور دونوں کا سرچشمۂ فیض جمالیاتی تجربے ہیں۔ آرٹ میں ہیئت کا وہی مقام ہے جو مذہب میں شریعت کی جگہ ہے اور اول الذکر میں فنی تجربہ کی وہی کیفیت ہے جو ثانی الذکر میں طریقت یا باطنی تجربے کی۔ لطیف وحسین باطنی تجربے آرٹ اور مذہب کی روح ہیں.....اسی منزل سے صوفی، نور وسرور حاصل کرتا ہے اور صناع میتھو آرنلڈ کے اسکالر جپسی کی طرح اسی شرارۂ سماوی سے سوز ونور پاتا ہے۔ حسن ہی مذہب اور آرٹ کی بنیادی قدر ہے اور اسی سے خوبی اور حمد کا وجود ظاہر ہوتا ہے''۔

یہاں یہ اعتراض بھی کیا جاسکتا ہے کہ فن کے اعلیٰ تجربے ایک طرح سے روحانی تجربوں سے مشابہت رکھتے ہیں اور مذہب کی باطنیت اور فن کی باطنیت میں مماثلت پائی جاتی ہے جو اس عبارت میں درج ہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو اختر اور ینوی کا یہ مقصد بھی نہیں ہے۔ وہ جہاں یہ کہتے ہیں کہ ''خود مذہب فنون لطیفہ میں لطیف ترین فن ہے'' وہیں یہ بھی لکھتے ہیں کہ آرٹ کی ایک بنیادی قدر عشق بھی ہے جو حسن کاری کا محرک بنتا ہے۔ اسی لیے اس کے دائرہ میں جہاں مسجد قرطبہ اور گوتم بدھ کے مجسمے آتے ہیں وہیں اسٹالین گراد کی جنگ کی داستان، شاہنامہ اور خمریات خیام بھی شامل ہیں۔

اختر اور ینوی کے نزدیک جمالیات فن کی اقدار حسن، فنکار کے احساس حُسن اور اس کی حُسن کاری کا علم ہے۔ وہ اسے انسانی جبلت کو جاننے کا علم بھی کہتے ہیں جو فطری طور پر ہر انسان میں موجود ہوتا ہے۔ اس لیے فنون لطیفہ کی تخلیق میں جبلت کو اساسی حیثیت حاصل ہے لیکن یہ امر بھی لائق توجہ ہے کہ انسانی وجود اور تمدن میں جبلت علیٰحدہ علیٰحدہ طور پر کام کرتی ہیں۔ اس ضمن میں یہ رقم طراز ہیں:

''غرض یہ کہ یہ جبلت جمال بڑی پرقوت جبلت ہے اور فنون لطیفہ کی دنیا میں اس جبلت کو آزادانہ ایک قدر اول کی حیثیت سے کام کرنے کا موقع ملتا ہے۔ فنون لطیفہ میں یہ جبلت رہبر توانائی کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہی بنیاد بنتی ہے اور یہی معیار بھی۔ کامیابی اور ناکامیابی کا معیار حُسن وقبح کا معیار۔ فنون لطیفہ کی تخلیق جمالیات کی اپنی خاص قلمرو ہے اور دوسرے شعبہ ہائے تمدن اس کی نوآبادیات ہیں۔ فنون لطیفہ کی مملکت میں جمالیات کا قانون چلتا ہے۔ اسی کے ضابطہ کی پیروی ہوتی ہے۔ ادب وشعر کی دنیا میں آئین حُسن کے سوا اور دوسرے آئین فیصلہ کن نہیں ہوتے۔ فنون لطیفہ میں دوسری قدریں بھی قدر جمال کے ماتحت ہوجاتی ہیں۔ اگر ہم فنون لطیفہ کی دنیا میں اور اقدار تہذیب وتمدن کو داخل بھی کریں تو انہیں سنوار کر خوبصورت بنا کر، حُسن تصویر، حُسن جذبہ، حسن تخیل اور حسن فکر کی مدد سے داخل کریں۔ تاکہ سلطنت فن میں سوائے جلوہ ہائے جمال کے اور کوئی جلوہ نہ ہو۔ ہاں اس کی ملکیت میں دوسری قدریں لباس تجلی میں آسکتی ہیں۔ بہرحال! حُسن آفرینی، حُسن نمائی، تفسیر حُسن اور تعبیر حُسن فن کار کا کام ہے۔''

واقعہ یہ ہے کہ فنکار صداقت یا حقیقت کو بھی حسین ومؤثر انداز میں پیش کرتا ہے۔ حالانکہ صداقتیں سپاٹ نہیں ہوتیں اور اس کی متعدد قسمیں ہوتی ہیں۔ تاریخی صداقت، سائنسی صداقت یا معروضی صداقت وغیرہ فنکار ان صداقتوں کو کھردرے انداز میں نہیں پیش کرتا بلکہ شعریت کے قالب میں ڈھال دیتا ہے۔ انھیں وہ لطافت بخشتا ہے اور صداقت کو حُسن کا تاج پہناتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ صداقت حُسن کے ساتھ جب تک ہم آغوش نہ ہوجائے تب تک وہ کرخت، کھردری اور بھونڈی نظر آئیں گی۔ ادب کا بنیادی کام حقیقت وجمال کے امتزاج سے ایسا فن پارہ خلق کرنا ہے جس کی تہوں میں زندگی کو بامعنی بنانے والی روشنی پوشیدہ ہوتی ہے۔

فنکار کی اصلی قدر وقیمت اس کی انفرادی کاوشوں پر منحصر ہے۔ یہ انفرادی کاوش صحیح معنوں میں اس کی قوت ہوتی ہے جو دوسرے قلم کاروں سے اسے علیٰحدہ کرتی ہے۔ اختر صاحب کا خیال ہے کہ ایک بڑا فنکار کسی دبستان، تصور یا نظریے کی جکڑ بندیوں سے آزاد ہوتا ہے۔ ہر چند کہ وہ سماج، ماحول، دبستان، اپنے دور اور اجتماعی تحریکوں سے گہرے اثرات قبول کرتا ہے باوجود اس کے اس کی لالہ کاری، گل طرازی اور رنگ ونور اس کی داخلی انفرادیت کے محتاج ہوتے ہیں۔

اعلیٰ ادب کے لیے ادیب کا صاحب فکر ہونا لازمی ہے۔ فکر میں جتنی پختگی ہوگی اتنا ہی فنکار کی تخلیقات میں توازن ہوگا، لیکن یہ امر بھی لائق توجہ ہے کہ فکر اور نظریے کی پختگی اور بالیدگی، احساس، جذبہ اور تخیل پر جب

بھاری پڑنے لگے تو فن کی بنیادیں ہل جاتی ہیں۔ وہ اس بات پر بھی توجہ دیتے ہیں کہ دنیا کے بڑے فنکار ایک واضح نظریۂ حیات رکھتے ہیں۔ یہ نظریۂ حیات اصلاً اقدارِ حیات ہے، جو ہمیں تعصب و جارحیت سے دور رکھنے، ہمدردی، انسانیت دوستی اور رواداری کو فروغ دے کر انسان میں ایسی صفات جنم دیتی ہے جو انسانی کمزوریوں سے چشم پوشی نیز عفو و درگزر جیسی صفتیں پنپنے لگتی ہیں۔

اختر اورینوی بنیادی طور پر افسانہ نگار اور شاعر ہیں، لیکن ان کی تنقیدی بصیرت اور فکر و شعور سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا بلکہ اپنے دور میں آل احمد سرور، کلیم الدین احمد اور احتشام حسین کے ساتھ مل کر ایک ایسی نئی روایت قائم کرتے ہیں جس میں یکسانیت کے بجائے تصور و فکر میں خاصا تنوع پایا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کلیم الدین احمد اور احتشام حسین دو انتہاؤں کے نقاد ہیں، جبکہ اختر اورینوی کے یہاں شدت پسندی کے بجائے اعتدال و توازن پایا جاتا ہے جو انھیں آل احمد سرور سے قریب کرتا ہے، بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ انھوں نے دو انتہاؤں کے درمیان جو راہ نکالی وہ اعتدال و توازن کی راہ تھی۔ ہر چند کہ ان کا مغربی شعر و ادب کا مطالعہ گہرا تھا اور متعدد مغربی تخلیق کاروں اور نقادوں سے کسب فیض بھی کیا، لیکن سائنس کے مطالعے نے ان میں جو تجزیاتی شعور اور سچ کی تلاش کی صلاحیتیں عطا کی تھیں اس کی بدولت کسی نظریے سے مرعوب ہونے کے بجائے تجزیے سے استنباط نتائج میں معروضیت کو اہمیت دیتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ وہ مغربی شعر و ادب کی عظمت کا فراخ دلی سے اعتراف کے باوجود، وہ تنقید میں مشرقی روایات کے علم بردار تسلیم کیے جائیں گے۔ یہ اسی روایت کا فیضان تھا کہ اپنی تنقیدوں میں مغربی حوالوں کے پہلو بہ پہلو مشرقی معیارے نقد سے فن پارے کی جانچ پرکھ کرتے ہیں۔ وہ انگریزی، فرانسیسی اور جرمن کے ادبیات کو ہی عالمی ادب قرار نہیں دیتے بلکہ عربی اور فارسی کی وسعتیں بھی اس دائرے میں آتی ہیں۔ اس لحاظ سے یہ کہنا مناسب ہوگا کہ اختر اورینوی کی تنقیدوں نے ایک حد تک اس خلا کو پُر کیا ہے، جو جدید تصور تنقید اور مغرب کے اصولوں کے سبب پیدا ہوئے تھے۔ یعنی مشرقی ادبیات سے بے اعتنائی نے برصغیر کے ادبی فن پاروں اور تصور نقد کو مشکوک کر دیا تھا۔ اختر اورینوی کا یہ اختصاص بھی لائق توجہ ہے کہ ایک تنقید نگار کی حیثیت سے انھوں نے جو تصور و نظریہ قائم کیا ہے اسے اپنے افسانوں اور شعری تخلیقات میں اطلاقی طور پر برتا بھی ہے نیز دوسرے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقی نگارشات کے تجزیے اور احتساب نقد میں بھی عملی طور پر بہ روئے کار لایا ہے، اختر اورینوی کا یہ رویہ انھیں نہ صرف اپنے معاصرین میں انفرادیت عطا کرتا ہے بلکہ اردو تنقیدی روایت میں قابلِ احترام بناتا ہے۔

○○

سائنس کے منتخب مضامین

اس کتاب کے مصنف محمد خلیل بنیادی طور پر ایک سائنس داں۔ انھوں نے طویل عرصے تک مرکزی حکومت کے زیر انتظام شائع ہونے والے میگزین ''سائنس کی دنیا'' کی ادارت کی ہے۔ وہ اس بات سے بڑی حد تک واقف ہیں کہ بچوں کے لیے کس طرح کے سائنسی مضامین پیش کریں۔ اس کتاب میں انھوں نے سادہ اور سہل انداز میں بچوں کو سائنس کی باتیں بتائیں ہیں اور انھیں یہ سمجھایا ہے کہ سائنس کوئی مشکل موضوع نہیں ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے ان موضوعات کو منتخب کیا ہے جو ہمارے اردگرد بکھرے ہوتے ہیں اور باتوں باتوں میں بچوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ سائنس کی ترقیات نے انسانی زندگی پر بڑا مثبت اثر ڈالا ہے اور انسانی زندگی کے اکثر شعبے سائنس کے اثرات سے خالی نہیں ہے۔ اس کتاب میں شامل بعض مضامین ایسے ہیں جو بچوں کے ساتھ بڑوں کی توجہ بھی اپنی جانب مبذول کریں گے۔

مصنف: محمد خلیل صفحات: ۸۰، قیمت: تیس روپے

ناشر: اردو اکادمی، دہلی